ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.1 (2026)
(January to March)

ارنسٹ ہمینگوے کے ناولوں میں آئس برگ تھیوری کا جائزہ

Unveiling the Iceberg Theory in Ernest Hemingway's Novels

محمد زاہد گل
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان
ڈاکٹر منصور احمد قریشی
شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، ملتان

Muhammad Zahid Gul
Ph. D Scholar Department of Urdu, NCBA & E, Sub Campus Multan
muhammadzahidgul@gmail.com
Dr. Mansoor Ahmed Qureshi
Department of Urdu, NCBA & E, Sub Campus Multan
drqureshi57@gmail.com

Article Details
Received:
February 25, 2026
Accepted:
March 10, 2026
Online Published:
March 18, 2026

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: This article undertakes a nuanced exploration of Ernest Hemingway's "Iceberg Theory" arguably the most defining principle of his artistic vision-as it manifests across five of his major novels The "Iceberg theory' functions as the very soul of Hemingway's novels. Rather than articulating emotions directly, Hemingway's Foremost artistry lies in rendering them through an economy of words, enriched with symbols, images, metaphors and subtle suggestions. Just as the greater mass of an iceberg lies hidden beneath the Sea's surface, so too does the deeper substance of the novel remain concealed beneath the visible text. Hemingway entrusts the reader with the taste of discovering meaning through the depths of their own understanding. This article offers a detailed examination of novels including The Old Man and the Sea, a farewell to Arms, The Sun also Rises, for whom the Bell Tools, and to Have and Have not. So that it may be discerned how the writer employs this technique to intensify expression and heighten narrative tension.

Key words: Iceberg Theory, Hemingway's novels, symbols, economy of words, farewell to Arms, intensify expression

ارنسٹ ملر ہیمنگوے (Ernest Miller Hemingway) ۲۱۔جولائی ۱۸۹۹ء کو شکاگو، امریکہ میں پیدا ہوئے۔ وہ بیسویں صدی کے معروف اور بااثر صحافی، افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ انھوں نے صحافت سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ صحافت کی بدولت ان کی نثر میں حقیقت نگاری اختصار اور سادگی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ہیمنگوے نے بھرپور زندگی بسر کی۔ وہ بند کمروں کے لکھاری نہیں تھے، بلکہ ان کی پوری زندگی مہم جوئی، سفر اور جنگوں پر مشتمل ہے۔ زندگی کے یہی تجربات ان کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم میں اٹلی کے محاظ پر ہیمنگوے نے بطور ایمبولینس ڈرائیور خدمات سر انجام دیں۔ دورانِ جنگ وہ زخمی ہوئے اور اس جنگی ماحول اور زخمی ہونے کے تجربے نے ان کی شخصیت، زندگی اور سوچ پر گہرا اثر ڈالا، جس کی جھلک ان کے افسانوں اور خاص طور پر ناول (A farewell to Arms) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی زندگی جدوجہد اور سنسنی سے بھرپور ہے۔ جنگِ عظیم اول، سپین کے کشیدہ حالات اور مسلسل خانہ جنگی کا ماحول، جنگِ عظیم دوم نے ہیمنگوے کو ہنگاموں میں مصروف رکھا۔ زندگی کے ان مشاغل نے اسے جو تجربات عطا کیے ان کی چھاپ اس کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے مشاغل میں شکار، بیل فائٹنگ، مچھلیاں پکڑنا اور طویل سفر شامل ہیں۔ جنگی تجربات کا نچوڑ ان کے ناول (A farewell to Arms) میں ملتا ہے۔ مچھلیوں کے شکار اور بزرگی میں زندہ دلی کا مظاہرہ ان کے ناول (The Old Man & The Sea) میں نظر آتا ہے۔ الغرض ان کے ناولوں میں جو تجربات بیان کئے گئے ہیں وہ حقیقت کے بہت قریب ہیں۔

ہیمنگوے کھوئی ہوئی نسل (Lost Generation) کے نمائندہ تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جس طرح انسانی اقدار کو زوال آیا اور انسان میں کس طرح فکری بدلاؤ آیا وہ اس کے گواہ تھے۔ جنگیں اپنے ساتھ ہر طرح کی تباہی لاتی ہیں، بھوک، افلاس، انسانی وقار کی بے حرمتی، اقدار کا زوال، خوف، موت، جہالت، یہی سب تو جنگوں کی دَین ہے۔ ہیمنگوے بھی اسی المیے کا شکار تھے۔ انہوں نے زندگی کے آخری چند سال کیوبا اور امریکہ میں بسر کیے۔ عمر کے آخری حصے میں وہ مختلف بیماریوں کا شکار رہے اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے ۲ جولائی ۱۹۶۱ء کو خودکشی کر کے رخصت ہوئے۔ وہ بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب تھے۔ انہیں علامتی افسانہ نگاری کے استاد کا درجہ حاصل تھا۔ وہ جدید نثر کے معماروں میں شامل تھے۔ ان کی تخلیقات کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

1. The Old Man and the Sea. (1952)

بوڑھا اور سمندر (مترجم: شاہد حمید)

2. A Farewell to Arms (1929)
3. For whom the Bells Tolls (1940)
4. The Sun also rises (1926)
5. To have and have not (1937)

ان کے ناول (The Old Man & the Sea) پر ۱۹۵۴ء میں نوبل پرائز ملا۔

ہیمنگوے کے ناولوں میں دیگر فکری و فنی رجحانات کے ساتھ ساتھ جو نظریہ سب سے اہم سمجھا جاتا ہے وہ ان کی "آئس برگ تھیوری" ہے۔ کسی کہانی یا ناول کا صرف تھوڑا سا حصہ ظاہر کرنا جو ضروری ہو۔ جس طرح سطحِ سمندر پر برفانی تودے کا تھوڑا سا حصہ نظر آتا ہے جبکہ اس کا بیشتر حصہ سطحِ سمندر سے نیچے ہوتا ہے۔ اسی طرح ہیمنگوے کا یہ کمال ہے کہ ان کی کہانی میں علامات، جذبات اور اَن کہے پہلوؤں کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ مصنف براہِ راست ان پہلوؤں کا تذکرہ نہیں کرتا بلکہ یہ سب قاری کے فہم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ہیمنگوے کے خیال میں اگر لکھاری کو اپنے فن پر عبور حاصل ہے تو وہ بہت سی باتیں بیان نہ کر کے بھی کہانی میں معنوی گہرائی پیدا کر سکتا ہے، یعنی کہانی یا ناول کا زیادہ حصہ پڑھنے والے کے شعور کے نیچے چھپا رہتا ہے۔ ان کے تقریباً ہر ناول میں "آئس برگ تھیوری" کا استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ ناول میں تو مکمل طور پر "آئس برگ تھیوری" کی چھاپ نظر آتی ہے جبکہ کچھ تحریروں میں خاص خاص مواقع پر اس کے استعمال نے نئی جہت عطا کی۔ ہیمنگوے کے نزدیک الفاظ سے زیادہ وقعت اس کے معنی کی ہے۔ کہانی یا

ناول کی روح ان پہلوؤں میں مُضمر ہے جو براہِ راست بیان نہیں کیے جاتے۔ اس تھیوری کے استعمال سے قاری میں بھی معنی کھوجنے، محسوس کرنے اور سوچنے جیسے رجحانات پنپتے ہیں۔ قاری کی فکر کو نیا زاویہ ملتا ہے۔ ہیمنگوے کے ناول اس تھیوری کی عملی تفسیر نظر آتے ہیں۔ بقول ہیمنگوے:

> "If a writer of prose knows enough about what he is writing about he may omit things that he knows and the reader.....will have a feeling of those things as strongly as though the writer had stated them" (1)

ا۔ "بوڑھا اور سمندر"

1. The Old Man and the Sea

یہ ناول ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ شاہد حمید نے اردو میں اس ناول کا ترجمہ کیا ہے، آئس برگ تھیوری کا سب سے زیادہ اطلاق اسی ناول میں نظر آتا ہے۔ انسانی جدوجہد کی گہرائی کو غیر بیانیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر تو یہ ناول ایک بوڑھے مچھیرے جس کا نام سینتیاگو ہے کی کہانی ہے جس کو مسلسل چوراسی دن تک شکار نہیں ملتا لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا۔ علاقے کے س ب مچھیرے اسے بدقسمت خیال کرتے ہیں۔ پچاسویں دن وہ گہرے پانیوں میں مارلن مچھلی کے شکار کے لیے جاتا ہے اور تین دن کی سخت جدوجہد کے بعد بالآخر وہ عظیم مارلن مچھلی کا شکار کر لیتا ہے۔ واپسی میں شارک مچھلیاں بار بار حملہ کرتی ہیں تاکہ اس سے مارلن مچھلی کا گوشت چھین سکیں، ان حالات میں بوڑھا سینیتا گو بھرپور مزاحمت کرتا ہے اور مچھلی کا کچھ حصہ بچا کر واپس لوٹ آنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ کوشش انسانی عزم وہمت، وقار اور روحانی کامیابی کی دلیل بن جاتی ہے۔ ہیمنگوے نے کہیں "فتح" یا "شکست" کا ذکر براہِ راست نہیں کیا۔ جب مسلسل چوراسی دن وہ مچھلی کے شکار میں ناکام رہا تو اس نے اسے ناکامی شمار نہیں کیا اور جب وہ عظیم مارلن مچھلی کا شکار کر کے لوٹتا ہے تو خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ اپنی کامیابی کا چرچا نہیں کرتا ہے۔ کہانی میں تمام تر جذبات خواہ وہ محبت و قربانی کے ہوں، یا مایوسی کے، جدوجہد عزم وہمت، صبر یا وقار کے، سب پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ ہیمنگوے "بوڑھا اور سمندر" میں لکھتے ہیں:

> "A man can be destroyed but not defeated."(2)

"انسان کو تباہ کیا جاسکتا ہے مگر اسے شکست نہیں دی جاسکتی"

ناول میں یہ جملہ آئس برگ تھیویری کی روح ہے۔ لکھاری نے دو لفظوں کے استعمال سے واضح کیا ہے کہ انسان کی عظمت یہی ہے کہ اسے جسمانی طور پر نقصان پہنچایا جاسکتا ہے لیکن روحانی طور پر فتح مند انسان ہی ہے، صرف دو لفظوں میں destroyed اور defeated کے فرق میں ناول کا پیغام چھپا ہے۔

> "He was comfortable but suffering, although he did not admit the suffering at all" (3)

"وہ آرام میں تھا مگر تکلیف بھی جھیل رہا تھا۔ اگرچہ وہ اس تکلیف کا اعتراف بالکل نہیں کرتا تھا"

ایک اور موقع پر لکھاری شکست کا تذکرہ تو کرتا ہے مگر اس کا انداز غیر جذباتی ہے۔ آئس برگ تھیوری کے استعمال سے وقار، صبر اور تسلیم کے جذبات کو خاموشی کی زبان میں بیان کیا ہے۔

> "He knew he was beaten now finally and without remedy and he went back to the stern and found the tiller." (4)

کہانی کے آخری منظر میں بوڑھا مچھیرا فتح مندی کے احساس کے ساتھ واپس آتا ہے۔ اس کے خواب میں امید، طاقت ور جوانی کی نشانی کے طور پر شیر کا تذکرہ ہے۔

"He dreamed of lines."(5)

"ببر شیروں کے خواب دیکھ رہا تھا"

ہیمنگوے نے ناول کے اَن کہے معنی کو قاری کے فہم پر چھوڑ دیا ہے۔ یہی آئس برگ تھیوری کی معراج ہے۔

2. A farewell to Arms

ارنسٹ ہیمنگوے کا یہ ناول ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول ایک طرح سے ہیمنگوے کی آپ بیتی بھی ہے۔ ہیمنگوے نے جنگِ عظیم اول میں بطور ایمبولینس ڈرائیور حصہ لیا اور زخمی بھی ہوئے، انہی یادوں کو اس نے ناول میں استعمال کیا ہے۔ ناول میں جنگی حالات، جنگ کی تباہ کاریاں، مضر اثرات، محبت، انسانی جدوجہد اور مایوسی کو موضوع بنایا گیا ہے، لیکن ان موضوعات کو براہِ راست بیان کرنے کی بجائے آئس برگ تھیوری کے ذریعے علامتوں اور خاموشی کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ بقول:

"Listen to what, people don't say." (6)

ناول میں صدمات یا دکھ کا اظہار براہِ راست نہیں ملتا بلکہ قاری اس کو محسوس کرتا ہے۔ مصیبت میں جو صدمات روح کی گہرائیوں تک اثر کرتے ہیں، ہیمنگوے نے انہیں یوں بیان کیا ہے کہ الفاظ کم اور تاثیر بے پناہ ہے:

"The world breaks everyone and afterward many are strong at the broken places." (7)

ہیمنگوے جنگ کا مخالف ہے، اس نے جنگی رومانیت کی مخالفت کی ہے، لیکن اس نے یہ احتجاج چیخ چیخ کر ریکارڈ نہیں کرایا بلکہ معنی خیز انداز میں چند سادہ الفاظ کے ذریعہ بیان کیا ہے۔

"I always embarrassed by the words sacred, glorious and sacrifice" (8)

ناول میں کیتھرین کی موت کے بعد فریڈرک کی حالت یوں بیان کی گئی ہے کہ اس نے صدمے میں چیخ و پکار نہیں کی بلکہ رونے کی بجائے "Statue" کا استعارہ استعمال کیا ہے جس سے روح کی گہرائی میں چھپے کرب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"But after I had got them out and shut the door and turned off the light it wasn't any good. It was like saying good-by to a statue. (9)

ناول کے آخر میں بارش کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ موت، صدمات اور قسمت کو بارش کے بہاؤ کے طور پر بیان کیا ہے۔

The rain was falling steadily. (10)

3. For Whom the Bells Tools.

ارنسٹ ہیمنگوے کا یہ ناول اسپین کی خانہ جنگی کی کہانی ہے۔ رابرٹ جوردن ناول کا مرکزی کردار ہے جو دھماکہ خیز مواد کا ماہر ہے اور ریپبلیکن فورسز کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اس کے ذمے دشمن کا ایک پُل (Bridge) گرانے کی ذمہ داری ہے تاکہ اس کے ساتھیوں کی پیش قدمی جاری رہ سکے۔ یہ پُل دشمن کے مورچے کے قریب ہے۔ رابرٹ جس گوریلا گروہ میں شامل ہوتا ہے اس میں ایک ماریا نامی لڑکی سے اسے محبت ہو جاتی ہے۔ ناول میں جنگی ماحول کی منظر کشی عمدگی سے کی گئی ہے، پُل کو تو وہ اڑا دیتے ہیں مگر

رابرٹ واپسی میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر جانا پڑتا ہے تاکہ وہ بچ سکیں۔ ناول کے آخر میں رابرٹ زخموں سے چُور دشمن کا انتظار کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ مرنے کے قریب ہے مگر دل میں یہ احساس جاگزیں ہے کہ یہ سب اس نے ایک مقصد کے لیے کیا ہے۔ بالآخر سب نے مرنا ہے، موت کی گھنٹی ہر کسی کے بجتی ہے۔ ناول میں آئس برگ تھیوری استعمال کی گئی ہے۔ جملے سادہ ہیں لیکن ان کی معنوی گہرائی بہت زیادہ ہے۔ انسانیت پر یقین کو ہیمنگوے نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"The world is a fine place and worth the fighting for." (11)

اس سادہ سے جملے میں ہیمنگوے نے انسانی عظمت، قربانی اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہو کر جان قربان کرنے کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ رابرٹ کی موت کو بیان کرنے کی بجائے قاری کو محسوس کرایا گیا ہے۔ یہ انسان کے شعور اور ضمیر کی آواز کو خاموشی کی زبان میں بیان کیا گیا ہے جو آئس برگ تھیوری کی بنیاد ہے۔

"He was complete integrated now and he felt the death inside him" (12)

زندگی کی آخری سانسوں میں جب سانس کی ڈور ٹوٹنے کے قریب ہے، جنگ کی دہشت کو غیر جذباتی مگر جامع الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

"He could feel his heart beating against the pine needle floor of the forest." (13)

محبت کے اظہار اگرچہ ہیمنگوے نے الفاظ کے سہارے ہی کی ہے مگر یہ صرف محبت کا اظہار نہیں بلکہ جنگ کی ہولناکی میں انسان کے بچ نکلنے کا استعارہ ہے۔ روحانی جذبے کو علامتی انداز میں بیان کیا ہے:

"I loved you when I first saw you and you always have loved me." (14)

کہانی کے آخر میں لکھاری نے رابرٹ کی موت کا منظر ایسے بیان کیا ہے کہ اس میں نوحہ یا رونا دھونا شامل نہیں بلکہ ایک پُرسکون موت کا انتظار ہے۔ احساس قربانی وہ جذبہ ہے جو موت جیسے صدمے کو بھی پُرسکون اور باوقار بنا دیتا ہے۔ یہی لکھاری کا کمال ہے کہ اس نے آئس برگ تھیوری کے استعمال سے موت کے منظر کو بھی سکون آور بنایا ہے۔

"He lay flat on the brown, pine-needle floor of the forest, his rifle by his hand, and waited." (15)

4. The Sun also Rises

ہیمنگوے نے یہ ناول ۱۹۲۶ء میں تحریر کیا۔ ناول کا مرکزی کردار جیک بارنہ ہے جو جنگ میں زخمی ہونے کی وجہ سے جنسی طور پر ناکارہ ہے۔ ناول میں آئس برگ تھیوری کو استعمال کرتے ہوئے محبت، مایوسی، جذبات اور نفسیاتی بحرانوں کو براہِ راست بیان کرنے کی بجائے علامات، خاموشی اور اَن کہی کیفیات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے جس سے ناول میں گہری معنویت پیدا ہوتی ہے۔ جیک کی جنسی کمزوری کو اشاروں میں بیان کیا گیا ہے۔ ناول کا بڑا حصہ آئس برگ تھیوری کے مصداق تہہ میں چھُپا ہے۔ جیک اور بریٹ کی محبت کو حالات کے ذریعے دکھایا گیا ہے، بیان نہیں کیا گیا۔ وہ دونوں آپس میں محبت تو کرتے ہیں لیکن ساتھ رہ نہیں سکتے۔

ناول میں کھوئی ہوئی نسل کا تذکرہ ہے جو بظاہر تو بے فکری سے جی رہی ہے، جو شراب پیتی ہے، سفر سے محفوظ ہوتی ہے، جشن مناتی ہے اور بیل فائٹنگ سے لطف اندوز ہوتی ہے مگر اس نسل کی روح اندر سے زخمی ہے اور وجودیت کے بحران کا شکار ہے۔ اس میں خالی پن ہے۔ جسے براہِ راست تو بیان نہیں کیا گیا لیکن علامتوں کے اظہار سے ظاہر کیا گیا ہے جیسے بیل فائٹنگ کو طاقت، مردانگی اور موت وحیات کی علامت کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ جیک کی مایوسی کو الفاظ کی بجائے علامات سے بیان کیا گیا ہے۔

"I can't stand it to think my life is going so fast and I'm not really living it." (16)

یہ جیک کی اندرونی کیفیت اور اس کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح لوگ سفر میں اس لیے بھی مشغول ہیں تاکہ اپنے اندرونی دکھ کو بھول سکیں۔ اس دکھ کو اشاروں میں بیان کیا گیا ہے جو کھوئی ہوئی نسل کی پہچان ہے۔

"You can't get away from yourself by moving from one place to another." (17)

جیک نے جنگ میں خود کو اور محبت کو کھو دیا، ان جذبات کا براہِ راست اظہار کرنے کی بجائے وہ ان الفاظ کا سہارا لیتا ہے جس میں بظاہر تو وہ مذہب کا ذکر کر رہا ہے مگر در حقیقت وہ اندرونی شناخت اسے کھو جانے کے دکھ کا شکار ہے۔

"I was a little ashamed, and I regretted that I was such a rotten Catholic." (18)

رات کا فسوں ہر بات اور جذبے کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ ہیمنگوے نے انسانی ذہن کی ٹوٹ پھوٹ اور جذباتی بحران کو رات کی کیفیت میں بڑے دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ رات کا کرب کیا ہے۔ دن میں تو انسان کے پاس کئی مصروفیات ہوتی ہیں لیکن رات اور تنہائی انسان کے کرب کو بڑھا دیتی ہے۔

"It is awfully easy to be hard boiled about everything in the daytime, but at night it is another thing." (19)

ناول کا اختتامی جملہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ بریٹ اور جیک کی نامکمل محبت کو بیان کرتا ہے جس میں کھوئے ہوئے خوابوں کی کَسک ہے اور شکست خوردہ نسل کی آخرہ آہ ہے۔

"Oh, Jake', Bret said, "we could have had such a demanded good time together." 'Isn't it pretty to think so?" (20)

ناول کا مرکزی خیال اسی جملے میں چھپا ہے جو آئس برگ تھیوری کی بہترین مثال ہے۔

5. To Have and Have Not.

یہ ناول ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ ناول یہ ناول فلوریڈا اور کیوبا کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ہیمنگوے نے جہاں زندگی بسر کی وہاں کے حالات کو ناول کی زبان میں بیان کیا ہے۔ ناول میں ہیمنگوے نے انسانوں کا پیدا کردہ طبقاتی فرق، غربت، انسانی جدوجہد اور بشری کمزوریوں کو بڑی گہرائی اور عرق ریزی سے بیان کیا ہے۔ دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی آئس برگ تھیوری کا استعمال کرتے ہوئے جذبات کو علامات میں بیان کیا گیا ہے۔ براہِ راست اظہار کی بجائے اشاروں، خاموشیوں اور مختصر سادہ جملوں سے کام لیا گیا ہے۔

ہیری مورگان کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ وہ ایک غریب مگر باہمت ماہی گیر ہے۔ وہ محنت سے کام کر کے روزی کماتا ہے اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، مگر معاشی ناانصافی اور حالات کے جبر کی وجہ سے اسے جرم کی دنیا میں پناہ ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ ایک امیر گاہک

اس سے دغابازی کرتا ہے اور پیسے نہیں دیتا جس سے اس کی روزی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ گھریلو پریشانیاں جو کہ مالی مشکلات سے جڑی ہیں اسے اسمگلنگ کی جانب لے جاتی ہیں۔ ناول میں ہیمنگوے نے امیروں کی عیاشیوں اور غریبوں کے درد میں تضاد کو بیان کیا ہے لیکن الفاظ کا سہارا نہیں لیا۔ ہیمنگوے یہ بیان نہیں کرتا کہ کون میرا ہے یا کون اچھا ہے۔ وہ خاموش انداز میں کرداروں کے اعمال سے اس فرق کی وضاحت کرتا ہے۔ ناول کے آخر میں ہیری گولی لگنے سے جان لیوا حد تک زخمی ہو جاتا ہے۔ مرتے وقت وہ سوچتا ہے کہ اس نے صرف زندہ رہنے کے لیے اتنی تگ و دو کی ہے لیکن "جن کے پاس سب کچھ ہے" وہ زندہ ہیں اور ان کی زندگیاں اس سے بہت جدا ہیں۔ ناول کا مرکزی خیال یہ ہے کہ دنیا چکی کے دو پاٹوں میں بٹی ہے۔ ایک وہ "جن کے پاس ہے" اور دوسرے "جن کے پاس نہیں ہے" اور یہ فاصلہ مسلسل بڑھ رہا ہے۔

ناول میں مختلف مقامات پر آئس برگ تھیوری کا عمدہ استعمال ہے۔ اپنی غربت کے بیان میں ہیری ان الفاظ کا سہارا لیتا ہے:

"You know how it is one day you are all right and the next you're not." (21)

اپنے اندر کی تنہائی اور ڈر کو براہِ راست بیان کرنے کی بجائے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"A man alone isn't got no bloody chance." (22)

ایسے ہی ایک اور مقام پر اپنی مجبوریوں کا تذکرہ اور اپنے گناہوں کا اعتراف براہِ راست نہیں ہے بلکہ اپنی ضرورت کا تذکرہ سے جس سے بات کی پوری نفسیات میں آجاتی ہے۔

"I hate like hell to take a man's last dollar, but I need it worse than he does." (23)

یہ جملہ آئس برگ تھیوری کی بہترین مثال ہے۔ دنیا کی ناانصافیوں اور اخلاقیات کو بیان کرنے کے لیے مختصر سے جملے میں پوری دنیا کے نظام، ظلم اور انسانی بے بسی کو سمو دیتا ہے۔

"You can't always do right, not in this world." (24)

ناول کے اختتامی جملے آئس برگ تھیوری کے نقطہ نظر سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ جب ہیری مر رہا ہوتا ہے تو اس کی سوچ میں نہ پچھتاوا ہے نہ جذبات، صرف وہ حقیقت بیان کر رہا ہے لیکن درپردہ اس موت میں شکست بھی ہے، محرومی اور بے بسی بھی۔ ارنسٹ ہیمنگوے کے ناولوں کا اصل جوہر کم الفاظ میں گہری بات کرنا ہے۔ جسے آئس برگ تھیوری کہا جاتا ہے۔ ان کے کردار بولتے کم ہیں۔ الفاظ کا چناؤ عمدہ، سادہ اور مختصر ہوتا ہے مگر اپنے اندر معنیٰ کا سمندر لیے ہوتے ہیں بالکل جیسے سمندری تو وہ جس کا بڑا حصہ سطحِ سمندر کے نیچے چھپا ہوتا ہے اور تھوڑا سا حصہ نظر آرہا ہوتا ہے۔ قاری کے فہم کو جانچنے کا بھی یہ ایک عمدہ طریقہ ہے۔ ہیمنگوے کے ناولوں میں قاری بھی ناول کے نئے مفاہیم تلاش کرتا ہے، ان پر غور و فکر کرتا ہے اور نتیجے پر پہنچتا ہے۔ ہیمنگوے نے مختصر جملوں اور خاموشی کی زبان میں اپنے پیغام اور بات کی گہرائی بیان کی ہے۔

واقعات کو اختصار سے بیان کرنا، جذبات کو چھپانا اور علامتی انداز ہیمنگوے کی پہچان ہے۔ سمندری سفر میں انسان کے جدوجہد کو علامتی انداز میں "The Old Man and the Sea" میں بیان کیا ہے۔ ناول میں آئس برگ تھیوری کا استعمال اتنے عمدہ انداز میں کیا ہے کہ اس ناول پر انہیں ۱۹۵۴ء میں نوبل پرائز ملا۔ موت اور مایوسی کے استعارے کے طور پر بارش کا تذکرہ " A farewell to Arms" میں ہے۔ "کھوئی ہوئی نسل" کے کرب کو "The Sun also Rises" میں بیان کیا ہے۔ جبکہ جنگ کی تباہ

کاریوں نے ہیمنگوے نے ناول "For Whom the Beu Tolls" لکھا ہے۔ ہیمنگوے کے ناولوں میں الفاظ نہیں بلکہ خاموشیاں کلام کرتی ہیں، یہی آئس برگ تھیوری کی اصل روح ہے۔

حوالہ جات

1. Hemingway, Ernest, Death in the Afternoon. New York: Scribner son, 1932.

2. ہیمنگوے، ارنسٹ بوڑھا اور سمندر، مترجم: شاہد حمید، ایفا پبلیکیشنز، گلبرگ II لاہور، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۰۳

3. ایضاً، ص: ۸۵

4. ایضاً، ص: ۱۱۹

5. Hemingway, Ernest. A Farewell to Arms, New York, Scribner son, 1929, P:249
6. Ibid, P:184
7. Ibid, P:335
8. Ibid, P:332
9. Hemingway, Ernest, for Whom the Bell Tolls, New York, Scribner son, 1940, P:472
10. Ibid, P:469
11. Ibid, P: 463
12. Ibid, P:389
13. Ibid, P:471
14. Hemingway, Ernest, The Sun Also Rises, New York; Scribner son, 1926, P:18
15. Ibid, P:19
16. Ibid, P:103
17. Ibid, P:213
18. Ibid, P:251
19. Hemingway, Ernest, To Have and Have Not, New York, Scribner's Son, 1937, P:14
20. Ibid, P:46
21. Ibid, P:72
22. Ibid, P:101
23. Ibid, P:189

References in Roman Script:

1. Hemingway, Ernest. Death in the Afternoon. New York: Scribner's Sons, 1932.
2. Hemingway, Ernest. Borha aur Samandar, Shahid Hameed. Lahore: IFA Publications, Gulberg II, 2015, p. 103.
3. Ibid., p. 85.
4. Ibid., p. 119.
5. Hemingway, Ernest. A Farewell to Arms. New York: Scribner's Sons, 1929, p. 249.
6. Ibid., p. 184.
7. Ibid., p. 335.
8. Ibid., p. 332.

9. Hemingway, Ernest. For Whom the Bell Tolls. New York: Scribner's Sons, 1940, p. 472.
10. Ibid., p. 469.
11. Ibid., p. 463.
12. Ibid., p. 389.
13. Ibid., p. 471.
14. Hemingway, Ernest. The Sun Also Rises. New York: Scribner's Sons, 1926, p. 18.
15. Ibid., p. 19.
16. Ibid., p. 103.
17. Ibid., p. 213.
18. Ibid., p. 251.
19. Hemingway, Ernest. To Have and Have Not. New York: Scribner's Sons, 1937, p. 14.
20. Ibid., p. 46.
21. Ibid., p. 72.
22. Ibid., p. 101.
23. Ibid., p. 189.